سیّد قطب کی سیاسی بصیرت

(سید قطب شہید کی حیات وخدمات پر مشتمل کتاب
"فولاد ہے مومن" کا ایک باب)

از عبید اللہ فہد فلاحی ایم اے شعبۂ سیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید قطب نے جس خاندان میں پرورش پائی وہ سیاست کے نشیب وفراز سے واقف اور ملک کی سیاسی فضا سے پوری طرح آشنا تھا۔ والد مرحوم ملک کی بڑی سیاسی پارٹی حزب وطنی سے وابستہ تھے جس کی سربراہی مصطفیٰ کامل جیسے مدبر کے ہاتھوں میں تھی۔ عنفوانِ شباب سے ہی سید قطب نے اس پارٹی کے ترجمان جریدۃ الحزب الوطنی میں مصری آزادی اور فرانسیسی وسامراجی طاقتوں کے انخلاء کا مطالبہ شدومد سے شروع کر دیا تھا۔ اس وقت الحزب الوطنی کے سامنے دو مقاصد تھے، ایک تو برطانی سامراج سے جنگ اور دیارِ عرب کی مکمل آزادی اور دوسرا اسلام کا نفاذ جس کے سایہ میں مسلمان اطمینان وسکون سے زندگی بسر کر سکیں۔ وطن کی آزادی کی قومی تحریک کے علم بردار سعد زغلول اور حزب الوفد کے کارکنوں کے ساتھ سید قطب کے

جولمحات گزرے وہ مصر کی آزادی اور بیرونی مداخلت کاروں کے انخلاء کے مطالبہ میں صرف ہوئے۔

وفد پارٹی سے سید قطب کا تعلق جس قدر مستحکم ہوتا گیا اسی قدر ان کے قلم کی جرأت، ظلم و استعمار کے خلاف تحریری نفرت اور غیر ملکی حکمرانوں پر تنقید کا عمل شدید ہوتا گیا۔ ابتدائے شباب کی بیشتر تحریریں آزادیٔ وطن کے نعروں سے پر ہیں۔ بیرونی سامراج کی ظل عاطفت میں حکومت کرنے والے حکمرانوں کے خلاف مصنف کے تند و تیز لہجہ و اسلوب نے انھیں عوام میں ممتاز کر دیا تھا اور لڑکپن کے زمانہ سے ہی حکومت کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگے تھے: چنانچہ وزیراعظم محمد محمود پاشا مرحوم کے زمانہ میں اخبارات میں ان کا ایک بیان شائع ہوا کہ "وہ لاقانونیت اور انارکی پھیلانے والوں اور امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں کو کسی قیمت پر برداشت نہ کریں گے اور اس طرح کی سرگرمیوں کی ہر صورت میں اجازت نہ دی جائے گی اور ان میں ملوث افراد کی لوہے کے ڈنڈے سے خبر لی جائے گی"

مصنف نے اس سرکاری بیان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وزیراعظم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی سخت تنقید کی:

> "یا صاحب الید الحدیدیۃ (اے لوہے کے ہاتھوں کے مالک!) اگر تو اپنے لوہے کے ہاتھوں پر نظر ڈالے گا تو تجھے معلوم ہوگا کہ وہ زنگ آلود ہو چکے ہیں اور مفلوج ہیں۔

وزیراعظم اس سخت تنقید کی تاب نہ لا سکا مضمون نگار کو ذاتی ملاقات کے لئے طلب کیا۔ سید قطب اس کے دفتر میں حاضر ہوئے تو ان کی عمر کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور تعجب سے پوچھا، کیا اس مضمون کے مصنف

سید قطب نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے اس قدر سخت اور بیباکانہ لہجہ میں تنقید کرنے کی وجہ پوچھی۔ نوجوان مضمون نگار نے فوراً کہا: "میرا عقیدہ یہی ہے"۔ فضیاعظم نے فراست سے کام لیتے ہوئے انھیں یہ کہہ کر رخصت کر دیا: جاؤ میرے بیٹے، جو جی میں آئے لکھو۔"[1]

یہ وہ دور ہے جبکہ اخوان المسلمون ابھی تشکیل کے مرحلہ میں داخل نہ ہوئی تھی۔ حسن البنّا شہید کا بھی عنفوان شباب تھا کیونکہ سید قطب اور حسن البنّا کا سال ولادت ایک (۱۹۰۶ء) تھا۔ البتہ آغاز ہی سے سید قطب کی سیاسی اٹھان کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک جری، بے خوف اور بیباک انسان تھے اور قدرت نے انھیں تحریر و تصنیف کا خصوصی ملکہ عطا کیا تھا۔ سامراجی طاقتوں، سرمایہ داری اور شاہی نظام کے خلاف ان کا اسلوب بالکل شروع ہی میں نکھر کر سامنے آچکا تھا البتہ اس میں وہ رخ (ORIENTATION) پیدا نہ ہوا تھا جو تحریک اخوان میں شمولیت کے بعد سامنے آیا۔ اس وقت ان کے سامنے ... کی بنیادوں پر تیشہ چلانا ہی اصل الاصول تھا۔ تخریب کے بعد تعمیر کا مکمل نقشہ ... ان کے ذہن میں واضح نہ تھا۔

مصنف نے قرآن کی منظر نگاری پر جب لکھنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ اسلامی نظام ... عیت اور ہمہ گیری ان پر منکشف ہوتی گئی اور ایک وقت وہ آیا جبکہ اسلام ... اجب العمل ہونے پر ان کا ایمان مستحکم ہو گیا اور انسانیت کے تمام مسائل ... انھیں اسلام کی صورت میں میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اخوان المسلمون ... کی شکل میں اسلام کی نمائندگی کر رہی تھی اور بائیں بازو کی قوتیں ... العصری کے پلیٹ فارم سے یہودیوں اور صہیونیوں کے عزائم کی تکمیل ... اب مصنف کا قلم جڑ پکڑ چکا تھا اور اسے اسلامی تحریک کی روشنائی

میں آنا شروع ہوگئی تھی۔ العالم العربی، الرسالۃ، المصری، اخبار الیوم، اخوان المسلمون، مصر الفتاۃ، بالعہد الجدید، الدعوۃ، النور المصری اور نور الاسلام جیسے اخبارات اور رسالوں میں آپ کی تحریروں نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ باطل کے ایوانوں میں آپ کے خلاف سازشیں رچی گئیں۔ سامراجی طاقتوں کے کان کھڑے ہو گئے کہ آواز بڑی بارعب اور بلند تھی اور صور اسرافیل کا کام کر رہی تھی۔ شاہ فاروق نے فاضل مصنف کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن وزیر اعظم محمود فہمی نقراشی کا نوجوان مصنف سے ذاتی تعلق تھا اس نے ذاتی دوستی کا بھرم رکھا اور شاہ کو اس حرکت سے منع کیا۔ دوسری طرف اس نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دو سال کی مدت کے لئے مصنف کو امریکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مقصد سید قطب کو گرفتاری سے بچانا اور ان کی بیباک تحریروں سے گلو خلاصی کر لینا تھا۔ اور یہیں سے قلب ماہیت کھا گئے۔ آپ نے ایک سال تک توقف کرتے رہے۔ دیت و لعل سے اس پروگرام کے متعلق کام لیتے رہے۔ بالآخر اعلیٰ تعلیم کے حصول، مختلف تعلیمی و تہذیبی نظاموں کا مشاہدہ اور سیاسی افکار کا تجزیہ جیسے مقاصد نے شہید امریکہ جانے پر رضا مند کیا۔ جہاں مختلف تحریکات کے سپہ سالاروں کی توجہ بھی آپ نے مختلف ادوار میں باطل قوتوں سے اختیار کی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں تحریک اسلامی کے علمبرداروں کو انقلابی فکر اور طریقہ کار سے ہٹا کر مختلف مسائل، تعلیمی تعمیری و تحقیقی اداروں اور منصوبوں میں باطل نے الجھانے کی کوشش کی ہے کہیں اسے کامیابی نصیب ہو چکی ہے مگر کہیں وہ جد و جہد جاری رکھے ہوئے ہے[۲]۔ لیکن امریکہ جا کر سید قطب کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی تباہ کاری بچشم سر دیکھی۔ امریکی معاشرت کا مطالعہ کیا اور اسلام پر ایمان و یقین میں اضافہ ہوا چنانچہ مصر واپس آکر تحریک اخوان المسلمون میں شمولیت اختیار کر لی۔

امریکی سیاست کا تجزیہ

فاضل مصنف نے امریکی سیاست کا مطالعہ خود اس کی لائبریری اور میدان عمل میں جا کر کیا تھا اس لئے ان کی معلومات، تجزیہ اور مختلف منصوبوں پر ان کے تبصرے حقیقت سے زیادہ قریب ہوتے تھے۔ باہر کا انسان امریکی سیاست کو اس کی معاشی و تکنیکی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے رفاہی و امدادی منصوبوں کی وجہ سے ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا۔ وہ مشرقی ممالک میں امریکہ کی شطرنجی سیاست کی چالوں کو نہیں بھانپ پاتا لیکن خود امریکہ میں رہنے والے انسان حکومت اور سرمایہ داروں کے چہروں پر پڑا ہوا نقاب ہٹا کر اصل حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ سید قطب نے اپنی تحریروں میں امریکی معاشی امداد اور ترقی پذیر ممالک کے لئے اس کے فلاحی پروگراموں سے نقاب ہٹا دیا اور امریکہ کے مکروہ عزائم طشت از بام کئے امریکی ... پر سید قطب کو زیادہ توجہ اس لئے دینی پڑی کہ شاہ فاروق کا دور امریکی ... کا دور تھا اور بعد کے ادوار ... بھی زیادہ تر مصری و عربی سیاست پر امریکی ... اور پالیسی بنانے والے چھائے رہے۔ مصر کے صدر انور سادات ... اپنی ڈائری "یا ولدی ہذا عمک جمال" میں امریکہ کے تئیں جن جذبات ... اظہار کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سربراہ حکومت پر متمکن طبقہ کتنی ... یا خطرناک سازش کا شکار تھا اور دشمنوں کے منصوبوں اور پالیسیوں ... کتنا خوش فہم تھا۔ ایک جگہ مصری سیاست کے پیچ و خم کا تذکرہ کرتے ...

... ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ امریکہ سامراجی عقلیت ... نقطۂ نظر اپناتے ہوئے معاملات و مسائل کی حقیقت کو سمجھتا

ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ امریکہ کی اپنی ایک سیاست ہے جو وہ اس علاقے میں اپنائے ہوئے ہے حالانکہ ہم لوگ عام طور سے یہی سمجھتے ہیں کہ امریکی سیاست سامراجی برطانوی سیاست ہی کا ضمیمہ ہے جبکہ عالم عرب میں برطانوی سامراجی سیاست دانوں کا اعلان یہ ہے کہ تنہا وہی وہاں کے حالات سے باخبر ہیں۔ میرے بیٹے! ان حقیقتوں کے انکشاف سے اس بات پر مزید روشنی پڑے گی جو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ انقلاب مصر کے تئیں امریکہ کا اپروچ اول روز سے برطانوی اپروچ سے یکسر مختلف رہا ہے۔ اور ہمارے درمیان اور امریکی سفیر کیفرے کے درمیان حقیقی دوستی استوار ہو چکی ہے اور یہ شخص اپنے تعلقات میں مخلص ہے۔

پہلے دن ہی ہم نے مسٹر کیفرے کی اس دعوت کو قبول کر لیا تھا جو انھوں نے شام کے کھانے پر ہماری کی تھی اور ہم سب اس کے گھر پر گئے تھے جبکہ مصر میں اور باہر دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ انقلاب مصر کے اصل افراد کون ہیں اور اس وقت برطانیہ سے تمام سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تھے یہاں تک کہ برطانوی سفیر کا مشرقی مشیر بھی ہماری شخصیات کو پہچاننے کی کوشش میں لگا ہوا تھا پھر ہمارے بعض صحافی دوستوں سے اس نے میل جول شروع کیا تاکہ ان کے ذریعہ ہم تک وہ رسائی حاصل کر سکے یا ہم سب کے ایک جگہ جمع ہونے میں وہ واسطہ کا کام کر سکے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ امریکی سفیر کا ہم سے برابر ربط تھا اور ہر بار وہ ہمارے اہداف و مقاصد کے ادراک کا اظہار کرتا تھا جس نے ہمیں یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا کہ امریکہ اپنے اس اعلان میں برحق ہے کہ وہ سامراجیت کے خلاف ہے اور سختی سے اپنے اس اصول پر کاربند بھی ہے اور وہ کمزور قومیں جو غیر ملکی

اقتدار کے شکنجہ میں پھنسی ہوئی ہیں انھیں اپنا فیصلہ آپ کرنے کے
حق کا وہ حامی ہے"[۳۷]

اس کے برعکس سید قطب امریکی شاطرانہ سیاست کے ان مہروں کو خوب پہچانتے ہے۔ وہ امن و امان کے خالی خولی دعووں اور سلامتی و یکجہتی کے پُر فریب ساحرانہ ہتھکنڈوں سے خوب واقف تھے۔ انھوں نے بہت سے امریکی منصوبوں کی حقیقت [illegible] کی۔ اس کی مسموم فکر، ذلت آمیز اقتصادی تعاون اور سودی پروگراموں پر مبنی اور امریکی امداد و تعاون کا تاجرانہ سیاست سے گہرا رشتہ قائم کر کے دکھایا [illegible] منڈیوں کی تلاش کے پیچھے اپنے پیداوار کی کھپت کے ذریعہ معاشی [illegible] غلبہ کا ناپاک منصوبہ بے نقاب کر دیا۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

[illegible] یہ جنگ چھیڑنا چاہتا ہے، اگر یورپ بھی اس کے نقش قدم پر چل پڑتا تو وہ جنگ کو برپا کرنے کے حادثے تک بھی صبر نہ کرتا۔ امریکہ تو برلن کے مشہور بحران [illegible] ایک پوری جنگ لڑنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ لیکن اس وقت تھکا ماندہ یورپ امریکہ کے شدید اصرار اور خواہش پر لبیک کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا [illegible] اپنے زخموں کو چاٹنے اور نقصانات کی تلافی کرنے میں مصروف تھا۔ [illegible] کافی طاقت حاصل ہو گئی تھی اور وہ آنے والے وقت [illegible] تیاری کر رہی تھی لیکن ڈالر کی اشتہا یورپ میں سب کچھ کر لے [illegible] تیسری عالمی جنگ سے وہ بالکلیہ کترا رہی تھی اور اسی وجہ سے [illegible] کی خواہش دبانا پڑی۔

[illegible] لئے ایک نئی جنگ چھیڑنے کی ضرورت شدید طور سے محسوس [illegible] مسئلہ ہے۔ پچھلی جنگوں میں جو علمی فتوحات تیزی سے [illegible] جنگوں کے درمیان امریکی صنعت و حرفت کو سامان جنگ

فراہم کرکے جو تجارتی فتوحات حاصل ہوئی ہیں انھوں نے امریکی صنعت و حرفت کی کئی گنا پیداوار تیار کرنے کے نئے مواقع بہم پہونچائے مگر اس کے ساتھ ہی اس پیداوار کی نکاسی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔

باوجودیکہ جنگ عظیم کے بعد منڈیاں ویران تھیں، انھیں شہری پیداوار کی سخت ضرورت تھی اور وہ یوروپی مقابلہ آرائی سے خالی تھیں پھر بھی ان کی قوت خرید کمزور تھی خاص کر تھکے ماندے اور زخموں سے چور یوروپ میں یہ قوت زیادہ کمزور تھی۔ چنانچہ امریکی نقطۂ نظر کے مطابق اس کا مطلب کساد بازاری ہی تھا اور اس کساد بازاری کا مطلب یہ تھا کہ امریکی سرمایوں کا زیاں زیادہ ہوتا۔ چنانچہ اس صورت حال میں امریکہ کا مارشل پلان سامنے آیا" ؎

مارشل پلان پر تبصرہ

فاضل مصنف نے اس تاریخی تناظر کے ساتھ مارشل پلان کا تجزیہ کیا اور اس کے تین بنیادی مقاصد قرار دیئے:

۱۔ امریکہ کی بڑھتی ہوئی پیداوار کی نکاسی کی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی گئی کہ پیداوار سے فائدہ اٹھانے والی حکومتوں پر امریکی ڈالر کی شکل میں نقد قیمت کی ادائیگی پر زور نہ دیا جائے کیونکہ امریکی حکومت یوروپی سلطنتوں کے لئے لیٹر آف کریڈٹ اس شرط پر کھولتی تھی کہ یہ حکومتیں اسے زیادہ تر امریکی مال کی خریداری میں خرچ کریں گی اور حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومت کے مارشل پلان کے نفاذ کے لئے امریکی سرمایہ دار بڑے بڑے ٹیکس برداشت کرتے تھے لیکن ان بڑے بڑے ٹیکسوں کے ساتھ

ایسا نفع بھی کماتے تھے جس کی وصولی میں مارشل پلان کے نفاذ کی صورت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا نیز وہ کساد بازاری کے خسارے سے بھی بچ جاتے تھے۔

۲۔ امریکہ کے مزدوروں کی بیکاری اور اس سے پیدا ہونے والی اجتماعی شورشوں سے تحفظ حاصل کیا جائے، کیونکہ مزدور جو اس سے پہلے جنگی ساز وسامان کی تیاریوں میں مصروف تھے، اب تعطل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کا تقاضا تھا کہ تمدنی پیداوار کی کھپت کی ایسی راہیں تلاش کی جائیں جو کارخانوں کو انتہائی حد تک مصروف رکھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ مارشل پلان کا نفاذ اور یورپین سلطنتوں کو مشینیں فراہم کرنا تھا جس کا ایک نتیجہ امریکی سرمایہ کو نفع حاصل ہونے کی صورت میں نکلتا۔

۳۔ اس کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو بین الاقوامی اقتصادی عمل کو بحال کیا جائے اور اس کے لئے یورپ کی از سر نو تعمیر کی جائے اور اس میں زندگی کی چہل پہل پھر سے لوٹ آئے اور دوسری طرف بیکار مزدوروں میں اشتراکیت کی اشاعت کو روکا جائے۔ مارشل پلان اس مقصد کی تکمیل میں معاون تھا۔[۲]

اوپر کے اقتباسات فاضل مصنف کی مشہور کتاب السلام العالمی والاسلام آخر مطبوعہ والآن..... سے ماخوذ ہیں۔ یہ باب کتاب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں موجود تھا لیکن ۱۹۵۲ء یعنی فوجی انقلاب کے بعد کتاب کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے ان میں سے یہ پورا باب استعماری طاقتوں نے خارج کر دیا اور اس باب کے بغیر کتاب چھاپنے کی اجازت دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی سفارت سے مصری حکومت اور مصری فوج کے کس قدر مضبوط تعلقات تھے اور

ان تنقیدوں سے امریکی مفادات کس بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔

اسی باب میں سید قطب نے ان مسائل پر بھی اظہار خیال کیا جنھیں آج ہم عالمی کساد کے بحران سے یاد کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اپنی تجزیاتی صلاحیت سے اور امریکی سیاست پر گہری بصیرت کی وجہ سے عالمی منڈیوں کا جو تجزیہ کیا وہ بڑی حد تک درست تھا۔ لکھتے ہیں:

"... لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ مارشل پلان کی عمر ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے، کیونکہ یورپین منڈیاں جب پُر ہو جاتیں تو فطری طور پر معاملات کا ایک معین حد تک آکر ٹھہر جانا عین تقاضائے فطرت تھا۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ یوروپ کے پیداواری وسائل و ذرائع انتہائی حدود کو جا پہونچیں۔ یورپ اپنی پیداواری قوت کو بحال کر رہا تھا اب وہ اس مقام پر پہونچ رہا تھا کہ نہ صرف خود تباہی سے محفوظ رہ سکے بلکہ دوسروں کو بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دے۔ اب یوروپین پیداوار اپنی منڈیوں کے ماسوا دوسری منڈیوں میں بھی امریکی پیداوار کی حریف و رقیب بن چکی تھیں)

اسی صورت حال میں برطانیہ نے اپنا پر فریب کھیل کھیلا اور امریکی عقل کی سادہ لوحی اور بین الاقوامی حالات سے اس کی بے خبری سے اس نے فائدہ اٹھالیا۔ یہ کھیل ڈالر کے مقابلہ میں اسٹرلنگ پونڈ کی قیمت کم کر دینے کا کھیل تھا۔ اس نے امریکہ کو موقع دیا کہ ڈالر کی سرکاری نہیں بلکہ واقعی قیمت کو قائم رکھنے کے لئے برطانیہ سے آگے بڑھ جائے۔ اس نے امریکہ سے اپنی مجبوری اور خوف کا مظاہرہ کیا حالانکہ اس کی نیت کچھ اور تھی جس کا اندازہ امریکہ کو بہت بعد میں ہو سکا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ اسٹرلنگ کے خلاف اثر میں امریکی مال کا نرخ بڑھ جانے

کے باعث اس پر منڈیوں کے دروازے بند ہو گئے اور وہ منڈیاں برطانوی مال کے فروخت کے لئے محفوظ ہو گئیں اس کے مقابلہ میں سٹرلنگ پاؤنڈ کی قیمت گر جانے کا اثر انگریزی مال کے نرخوں پر نہ پڑا۔ اس حلقہ کے علاوہ انگریزی مال کے نرخ امریکی مال کے مقابلہ میں پہلے سے بھی ارزاں ہو گئے۔

آخر جب امریکہ کو اس فریب کا پتہ چلا تو اس نے اس کا جواب عالمی منڈیوں سے ہر قسم کے خام مال کو کھینچ لینے کی صورت میں دیا۔ اسے یہ قدرت حاصل تھی کیونکہ اس کی قوت خرید دوسروں سے زیادہ تھی نیز عالمی منڈیوں میں اس کا رسوخ جانچ پڑتال کی قوت اور نقد سکہ نسبتاً زیادہ تھا۔ امریکہ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ برطانوی صنعت کے مقابلہ میں خام مال کی قیمت چڑھا دی جائے۔ اس صنعت کو مقابلہ کی طاقت سے کمزور کر دیا جائے، کیونکہ خام مال کی قیمت بڑھ جانے کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی صنعت مجبوراً اپنی پیداوار کا نرخ بڑھائے اور اس طرح برطانوی اور امریکی نرخوں میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائے مثلاً اُون خام مال کی قیمت پانچ سو فیصد بڑھ گئی کیونکہ اُون انگریزوں کی ایک بڑی صنعت ہے۔ اس طرح برطانوی مکر کے مقابلہ میں جدید طرز عمل کی بدولت ہر اس خام مال کی قیمت چڑھ گئی جس کی بنیاد پر انگریزی صنعت قائم تھی۔ گرانی کی وہ لہر جو عالمگیر جنگ کی تیاریوں سے پیدا ہونے والے دوسرے قدرتی اور عادی اسباب کے علاوہ دنیا بھر پر محیط ہو گئی تھی اس کا بڑا سبب یہی تھا۔

لیکن یہ امریکی سرگرمی ایک معین حملہ کی روک تھام کے لئے ہنگامی کارروائی سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکی ورنہ امریکی پیداوار کے تعلق سے منڈیوں کی عام حالت کچھ زیادہ متاثر نہ ہوئی البتہ اسے

ایک بڑا دھچکا یہ لگا کہ عالمی منڈی کے ایک اہم مقام چین کو اشتراکیت نے اپنے جال میں پھانس لیا۔ چین پچاس کروڑ انسانوں کا مسکن ہے جو تقریباً دنیا بھر کے باشندوں کا ایک چوتھائی ہے۔ چین بنیادی طور پر امریکی مال کی منڈی نہ تھا لیکن جاپان کی شکست کے بعد امید تھی کہ وہ یہ حیثیت اختیار کرلے گا لیکن اشتراکیت نے اسے اپنی آغوش میں لے کر یہ راستہ بند کر دیا اور امریکی مصنوعات کو کسی قدر تنگی اور گھٹن کا احساس ہوا۔ اسی طرح اجتماعی حلقوں نے بیکاری پھیلنے کا خدشہ محسوس کیا۔ جنگ کوریا سے کچھ پہلے بیکاروں کی تعداد پچاس لاکھ تک تھی لیکن جنگ ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد گھٹ کر تیس لاکھ رہ گئی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے لئے جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ اگرچہ کوریا کی جنگ نے بیس لاکھ انسانوں کو ہضم کرلیا تھا لیکن بس ایک جنگ مسئلہ کے حل کے لئے کافی نہ تھی۔ امریکہ کو ایک وسیع پیمانے کی جنگ درکار تھی جو ایک طرف تو تمام بیکار انسانوں کو ہضم کرلے اور دوسری طرف سرمایہ کے لئے پورے نفع کی ضمانت بھی دے۔ پس آج امریکی نقطۂ نظر سے جنگ قومی زندگی کی ایک ضرورت بن چکی ہے اور تقاضائے حال کے بموجب عالمی کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی قومی خواہش اس پر مستزاد۔ عالمی اشتراکیت کا یہ سیلاب ہر روز ایک نئی سرزمین کو فتح کرتا اور ایک نئی منڈی پر قفل چڑھاتا جارہا ہے۔"

امریکی سیاست کے حربے

سید قطب نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے کہ کس طرح روس اور امریکہ پوری

دنیا کو اپنی شکارگاہ سمجھتے ہیں۔ وہ برابر اس فکر میں ہیں کہ باقیماندہ دنیا کو آہستہ آہستہ اپنے حصار میں کھینچ لیں اور دنیا کے تمام اقتصادی، جغرافیائی اور انسانی وسائل کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں۔ فاضل مصنف کے نزدیک سرمایہ داری امریکی قیادت میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل حربے آزماتی ہے :

۱۔ پوری دنیا اور خاص طور پر جاگیردارانہ عرب ملکوں کے سرمایہ داروں کو اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خوف زدہ کرتی ہے اور سامراجیت اور سرمایہ داری کے درمیان مشترک امور کی موجودگی کی وجہ سے مقامی اور عالمی سرمایہ داریوں میں طبعی طور پر معاہدہ ہوجاتا ہے۔

۲۔ جو ممالک سامراجیت کی براہ راست یا بالواسطہ غلامی میں مبتلا ہیں، ان میں سیاسی و اقتصادی دباؤ کام میں لاتی ہے اور بسا اوقات مسلح تشدد بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتی۔ تمام عرب ممالک میں یہی صورت حال ہے۔

۳۔ کئی عنوانات کے تحت ڈالر کی ساحری کو استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ مارشل پلان کے بعد "اقتصادی امداد" کا عنوان یہی کام کرتا ہے۔ یا ٹرومین کے پلان میں "چوتھے نقطہ" کا عنوان یہی محرک رکھتا ہے۔[۸]

فاضل مصنف کے نزدیک یہ لابی عام طور پر حاکم اور استحصالی طبقوں کو اپنا مخاطب بناتی ہے اور عوام کو زیادہ منہ نہیں لگاتی کیونکہ ان طبقوں کے مفادات سرمایہ دار لابی کی فتحیابی سے وابستہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ لابی ان کے لئے بڑے معرکے سر کرتی ہے لیکن قومی و عوامی مقاصد سے بالکلیہ انحراف کرتی ہے اور فاضل مصنف کے نزدیک امریکی قیادت میں چلنے والی سرمایہ داری کا یہ موقف اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ یہ قومیں اپنے پیروں پر خود کھڑی نہیں ہوجاتیں اور اس بات کا واضح ثبوت بہم نہیں پہونچاتیں کہ وہ اپنے شعبدہ باز سرداروں اور لیڈروں کی

شعبدہ بازی سے مسحور نہیں ہیں اور انھوں نے طے کر لیا ہے کہ سامراج اور سرمایہ داروں کے لئے حقیقی مشکلات کا باعث بنیں گی اور جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اس لابی اور اس کی فوجوں کے مصالح کو حقیقی خطرات کی راہ میں نظر انداز کر دیں گی۔ فاضل مصنف کے نزدیک، جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے گی تبھی سامراجی سرمایہ دار لابی ان قوموں کی چیخوں پر کچھ کان دھرنے کی فکر کرے گی۔[9]

کمیونزم پر تبصرہ

فاضل مصنف کا اصل نشانہ امریکی سرمایہ داری رہا ہے۔ ان کی آتشیں تحریروں کا رخ اصلاً سامراجی امریکہ کی طرف ہے لیکن روس کی چالبازیوں، کمیونزم کی فکری بے راہ روی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے ناپاک ہتھکنڈوں کے خلاف خاموشی اختیار نہیں کی۔ آپ نے اشتراکی حربوں سے بھی بحث کی ہے اور انسانیت کو ان دونوں بلاکوں سے متنبہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک اشتراکی بلاک عوام سے مخاطب ہوتا ہے جنھیں طویل عرصہ سے محروم رکھا گیا ہے۔[10] وہ ہتھکنڈے کے طور پر سامراج کی بدکاریوں اور جرائم کو استعمال کرتا ہے۔ غلام قوموں کی اس خواہش کو کام میں لاتا ہے کہ وہ اپنی گردنوں سے غلامی کا جوا اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ اس طرح یہ بلاک مغربی صلیبیت اور مقامی سرمایہ داری کے ہر حقیقی اسلامی دعوت کا مقابلہ کرنے سے فائدہ اٹھاتا اور ہر اسلامی اجتماعی عدل وانصاف کی تحریک کو ناکام کرنے میں مدد لیتا ہے۔[11]

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی تضاد نہیں ہے:

عام طور پر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اس وقت دو بلاکوں میں منقسم ہے ایک سرمایہ دا

کا بلاک ہے جس کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا کمیونزم کا بلاک ہے جس کی سربراہی روس کر رہا ہے اور ان دونوں بلاکوں میں افکار و نظریات اور مفادات کے تعلق سے اینٹ اور کتے کا بیر ہے۔ فاضل مصنف نے اس نقطۂ نظر کی تردید کی ہے۔ سید قطب کے نزدیک ان دونوں بلاکوں کے درمیان یہ فرق ظاہری اور مصنوعی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تقسیم مصالح و مفادات کی تو ہو سکتی ہے افکار و نظریات کی نہیں ہو سکتی۔ یہ منڈیوں اور شکارگاہوں کا بٹوارہ ہے اصول کا عقائد کا نہیں۔ روح کے اعتبار سے دونوں میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جوہر دونوں کا ایک ہے۔ دونوں زندگی کی مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک روحانیت کی کوئی ضرورت اور بنیاد نہیں ہے۔ تاریخ اور حیات و کائنات کی مادی تعبیر و تصور میں دونوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں جو مادی فکر رائج ہے وہ اخلاقی اخلاقی اقدار کو افادی قرار دیتی ہے اور مصالح و مفادات کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ وہ زندگی سے روحانی عنصر کی نفی کرتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر ایمان کی تردید کرتا ہے اور اعلیٰ قدروں کی تذلیل کرتا ہے اور Pragmatism فلسفہ کی طرح اشیاء کی حقیقت بس ان کے وظائف و اعمال سے معلوم کرتا ہے۔ اس پورے فکر کے پس پردہ وہی مادیت کام کر رہی ہے جو مارکسزم کی روح ہے۔ روسی اور امریکی فکر کے مزاج میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ معاشرتی و معاشی حالات میں ہے۔ عام امریکی شہری کو کمیونزم کی طرف مائل ہونے میں جس رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے وہ زندگی کا کوئی ایسا تصور اور نظریہ نہیں ہے جو کائنات، حیات اور تاریخ کی مادی تفسیر کا انکار کرتا ہے بلکہ اس کے سامنے محض یہ امید ہوتی ہے کہ امریکی معاشرے میں دولت کمانے کے زیادہ مواقع ملیں گے اور مزدور کو اجرت بھی زیادہ ملے گی اور کمیونزم کی دنیا میں یہ مواقع چھن جائیں گے۔

سید قطب کے نزدیک حقیقی رزم گاہ مشرقی و مغربی بلاک اور اسلامی ممالک ہیں۔ اسلام کے مقابلہ میں یہ دونوں دشمن متحد ہیں افکار و نظریات کی سطح پر بھی اور مفادات و مصالح کی سطح پر بھی۔ یورپ، امریکہ، روس اور چین وغیرہ ممالک کی مادیت کی راہ میں حقیقی رکاوٹ صرف اسلام ہے۔ صرف اسلام وہ نظام ہے جو وجود اور حیات سے متعلق ہمہ گیر، جامع اور مکمل تصور دیتا ہے اور باہم کشمکش اور رزم و پیکار کی جگہ باہم تعاون و تعامل قائم کرتا ہے۔ انسانیت کو وہ روحانی اصول دیتا ہے جو خالق ارض و سماء سے انسان کا رشتہ جوڑتے ہیں اور زمین پر اس کی مرضی قائم کرتے ہیں۔ محض مادی اغراض کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ نہیں کرتے اگرچہ مفید مادی عمل کو عبادت الٰہی کا درجہ دیتے ہیں۔[۱۲]

سید قطب نے فراستِ مومنانہ سے کام لیکر جو بات اپنے زمانہ میں کہی تھی وہ اب مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ ایرانی انقلاب کے خلاف امریکہ کی ریشہ دوانیاں، افغان جہاد کی روسی درندوں سے مزاحمت اور لبنان و فلسطین میں دونوں بڑی طاقتوں کا کھیل اس حقیقت کو منوانے کے لئے کافی ہیں کہ یہ دونوں بظاہر باہم دشمن اسلام کے خلاف متحد ہیں اور مسلمانوں کے مسائل پر ان کی پالیسی ایک رہتی ہے اور یہ کہ اسلام ہی ان دونوں انسانیت کش طاقتوں کا توڑ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مصری سیاست کا محاسبہ

سید قطب ان مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں تھے جو عالمی افکار و نظریات پر تو بڑھ چڑھ کر تنقید کرتے ہیں لیکن ملکی و مقامی فکر کو شتر بے مہار چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کا محاسبہ کرنے سے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے یا انھیں اپنے

گروہ پیش کے باطل کا سراغ لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور اس طرح مقامی صورت حال میں عالمی طاغوت کی تلاش سے وہ عاری ہو جاتے ہیں جبکہ تحریک اسلامی کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ اپنے معاشرے پر پہلے نظر ڈالے اور اردگرد کی برائیوں اور غلط افکار پر پہلے تنقید کرے پھر عالمی و بین الاقوامی دشمنان دین کا بھی بے لاگ محاسبہ کیا۔ شاہ فاروق اور جمال عبدالناصر کے ادوار پر نگاہ ڈالی اور ان کی سامراجی خدمات پر بھی بھرپور وار کیا اور اسی وجہ سے مصری حکام نے آپ کے خلاف سخت نوٹس لیا۔

مصری معاشرہ میں ایسے ارباب کمال اور فضلاء کی کمی نہ تھی جو اسلام کی تعلیمات کو جرأت سے پیش کر رہے ہوں اور زندگی کے ہر میدان میں اسلام کی نمائندگی اور ترجمانی علمی سطح پر نہ کرتے ہوں۔ کمی صرف اس بات کی تھی کہ اصولی طور پر اسلامی تعلیمات پیش کرنے کے ساتھ موجودہ معاشرہ پر اس کا عملی انطباق بھی کیا جاتا اور مومنین و منافقین، یہود و کفار اور دوسرے قرآنی کرداروں کو موجودہ سوسائٹی میں تلاش کیا جاتا، عالمی سامراج کی خدمت کرنے والوں کا پتہ چلایا جاتا اور تحریک اسلامی ان ساری طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی۔ اخوان المسلمون نے یہی کام انجام دیا۔ اس کے مصنفین میں سید قطب کو وہ امتیازی مقام حاصل ہے جس نے انھیں عالمی و مقامی استعمار کا دشمن قرار دیا۔ اور ساری طاقتیں مل کر ان کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہوگئیں۔

شاہ فاروق کے زمانے میں حکومت وقت کو سامراج کا ایجنٹ قرار دیا اور اس پر کڑی تنقید کی:

"مقامی سرمایہ داری اور مغربی سامراج کے درمیان فطری مادی معاہدہ موجود ہے۔ غلام بنانے والوں اور سامراجیوں کا یہ ایک مشترکہ مفاد ہے۔ یہاں

کے سرکش اور سامراجی اس ظلم و استحصال سے ذرا بھی نیچے اترنے کو تیار نہیں ہیں جس پر وہ مسلسل ڈٹے رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سامراج ہی ان کا واحد مادی سہارا ہے۔ ان کا خالق اور پرورش کرنے والا وہی ہے اور اسی نے انھیں اقتدار اور سرمایہ بخش رکھا ہے۔ اس سامراج نے ان غداروں کو صلہ دیا تھا جنھوں نے عرابی کے لشکر کو دھوکہ دیا تھا اور مصر میں سامراجی حملہ آور فوج کی مدد کی تھی۔ اس نے انھیں زمینیں اور مال و دولت عطا کئے تھے۔ حتیٰ کہ آج وہ شریف گھرانوں کے افراد کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور باعزت خاندانوں کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔[۱۳]"

سفید فام انگریزوں کی جگہ سیاہ فام انگریزوں کی حکمرانی

انگریزوں کے مصر سے رخصت ہو جانے کے بعد آزاد مصر میں جن لوگوں نے عنانِ حکومت سنبھالی وہ اپنے فکر و نظر، رہائش و زیبائش وابستگی و وفاداری طرزِ سیاست و معاشرت میں انگریزوں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے فرق صرف یہ تھا کہ سفید فام کی جگہ سیاہ فام تھا۔ بیرونی مداخلت کی جگہ اندرونی سامراجیت تھی۔ انگریزوں نے ملک تو چھوڑ دیا لیکن معیشت و سیاست اور فکر و تربیت میں اپنے منتخب حکمرانوں کو قائم [illegible]

[illegible]

انگریزوں کو معلوم تھا کہ جلد یا بدیر مصر کو چھوڑنا ہی پڑے گا [illegible]

[illegible]

بازاروں کو اپنی نو آبادیات میں شامل رکھنے اور مصری پیداوار کو عالمی [illegible] میں جانے سے روکنے کے لئے انھوں نے اقتصادی میدان میں [illegible]

امداد کا سلسلہ شروع کیا اور کونسی وغیرہ کے تبادلوں کے ذریعہ مالی دنیا میں تعاون کا آغاز ہوا لیکن ان تمام امدادی پروگراموں سے انگریزوں کی بقا کا سامان فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اگر اس اندرونی سامراج کا وجود نہ ہوتا جس نے ماضی میں کارنامے انجام دیئے تھے اور جس کی سرپرستی ان دنوں بطور خاص کی جا رہی ہے۔ حکومت کے ایوانوں سے سفید فام انگریز رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ ان سیاہ فام مصری انگریزوں نے لے لی جن کے افکار و نظریات پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور جو سامراج کی سرپرستی میں سامراجی مقاصد کے لئے ڈھالے گئے تھے۔ سفید فام انگریز نے وزارت تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی جو نوجوان نسلوں کی تربیت کا کام کرتی تھی اب یہ وزارت سیاہ فام انگریزوں کے حوالے ہوئی تو سفید فاموں کو پورا اطمینان تھا۔ چنانچہ نظام تعلیم، طریق تعلیم، کتابیں اور منصوبے سب فکر و روح کو نوآبادیاتی مقاصد کے لئے ڈھال رہے ہیں اور ہم سب دین کے تھوڑے سے عنصر کو شامل کر کے صرف حکومت ہی میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں جاری و ساری ہے۔

اس نوآبادیاتی نظام نے کئی نسلیں پروان چڑھائیں جو وزارت تعلیم کی نگراں عقلیت اور اس منطق و فلسفہ سے مالا مال ہیں کہ اسلام دور انحطاط کی ایک یادگار ہے اور جمود و جہالت کے الزام سے بچنے کے لئے اور مصر کی آزادی و ثقافت کو روشن رکھنے کے لئے اس سے پیچھا چھڑانا ناگزیر ہے۔

مصری مدارس اور کتب میں تاریخ کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا سامراج نے کسی مقصد کے تحت ہی شروع کیا تھا۔ مقصد تھا کہ قومی و دینی روح کو یکساں طور پر قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا

ایک طالب علم بلکہ یونیورسٹی کا کالج تک تعلیم بھی تاریخ کے مطالعہ سے فارغ ہوتا ہے اور اسے اسلام کی اجتماعی فکر اور اس کے انسانی نظریہ سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ تاریخ اسلامی کے نام پر بس غزوات و سرایا اور واقعات و حادثات کا انبار جمع کر لیتا ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اسلام ایک جنگی تحریک تھی اور وہ کبھی فکری انقلاب یا اجتماعی یا انسانی پیغام نہیں تھا۔"[۱۲]

اس طرح سید قطب نے مصر کے اندرونی نظام پر انگلی رکھ کر بتایا کہ خرابی کہاں ہے۔ وزارت تعلیم پر آپ نے خاص توجہ دی اور نظام تعلیم، طریق تعلیم اور نصاب تعلیم پر کافی تنقید کی کیونکہ فاضل مصنف کو تعلیم و تدریس کا کافی تجربہ تھا۔ امریکہ جانے سے پہلے انسپکٹر آف اسکولس تھے اور امریکہ جاکر آپ نے ولسن ٹیچرس کالج، گرلی کولوراڈو ٹیچرس کالج، واشنگٹن اور کیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے لئے قیام کیا اور وہاں کے نصاب و نظام تعلیم کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہونچے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور انگریزوں کو امریکیوں کی اس چال کا علم ہوا کہ

توپ کھسکی، پروفیسر پہونچے
جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

تعلیم کے ذریعہ مغربی نظام نے نئی نسل کے اندر جو تباہ کن جراثیم پھیلائے اور کتابوں اور خطبات کے ذریعہ نوجوانوں کو اخلاقی اقدار اور مذہبی تعلیمات سے بیگانہ کیا اس پر سید قطب کی گہری نگاہ تھی اسی لئے اپنی تنقیدوں کا زور

خدمات تعلیم پر صرف کرتے رہے ہیں[۱۵]

مذہبی ٹھیکیداروں کا جائزہ

سید قطب نے ان تنخواہ دار سرکاری علماء پر بھی کڑی تنقید کی اور طاغوت کی حکمرانی میں ان کے ظالمانہ کردار پر انگلی اٹھائی جنھیں عوام غلطی سے مذہب وملت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خواہشات کی بندگی میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ ایک طرف ذہنی تنگی اور مسلکی تعصب میں گرفتار ہوتے ہیں اور دوسری طرف روح اسلام سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"فکر اسلامی کا چہرہ مسخ کرنے میں استعمار کی مدد کرنے والا ایک عنصر اور ہے جس سے زیادہ مفید اور بار آور عامل کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ شیوخ اور درویش ہیں جنھیں عوام الناس نے دینداری کا سرٹیفکیٹ عطا کر رکھا ہے۔ جمود فکر اور تنگیٔ ذہن کی بہترین نمائندگی یہی لوگ کرتے ہیں۔ خرافات اور جہالت کے سراپا ترجمان ہوتے ہیں اور ان ساری غیر اسلامی غیر انسانی رسوم وروایات پر دین کا لیبل لگا دیتے ہیں اور دین کی وکالت اس طرح کرتے ہیں کہ آدمی کو اس سے نفرت آجائے اور وہ منہ موڑ کر دوسری طرف چلا جائے۔ یہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں بڑے گھناؤنے جرائم کرتے ہیں اور دین کے احترام وتکریم اور افادیت کو مشکوک بنا دیتے ہیں خاص طور پر جبکہ آیاتِ الٰہی کے عوض یہ سودے بازی کرنے پر اتر آتے ہیں اور قرآن واسلام کے نام پر ظلم واستحصال کی مدد کرنے لگتے ہیں[۱۶]۔"

ہر مجدد ملت اور مصلح وقت نے ان علمائے سوء کے کردار پر تنقید کی ہے۔ باطل نے ہر دور میں اپنے مظالم اور غیر اسلامی اقدامات کی تائید علمائے دین اور جاہل مشائخ

ے حاصل کی ہے ۔ انہی دنیا دار مذہبی رہنماؤں کی بدولت وہ ہر زمانے میں اسلام کا
بل لگا کر غیر اسلام کی ترویج کرتا رہا ہے اکبر کے دین الٰہی کی ایجاد میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔
ثال کے طور پر زعفران اور لال کپڑے کا جواز حاجی ابراہیم سرہندی نے نکالا تھا۔ بادشاہ
ے سجدہ کرنے کا فتویٰ قاضی خاں بدخشانی نے دیا تھا اور ملا عالم کابلی کو اس کا افسوس رہا
ہائے مجھے یہ کیوں نہ سوجھی[17]۔ غرضیکہ اس کے دور میں جتنی خرافات پرورش پائیں ان
سب کا سہرا علمائے سوء ہی کے سر بندھتا ہے چنانچہ مجدد سرہندیؒ کو ان علمائے سوء کے
خلاف بھی محاذ بنانا پڑا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے معاشرہ کے تمام طبقوں پر تنقید کرنے کے
ساتھ علمائے دین اور طالبانِ علم دین کو بھی خطاب کیا اور ان کے نقائص پر بھرپور چوٹ
کی[18]۔ سید قطب نے بھی انھیں معاف نہ کیا اور ان کی دنیا دارانہ روش پر گرفت
کی۔

اس طرح سید قطب نے استعماری صحافت کا بھرپور جائزہ لیا اور اس پر بھی تنقید کی۔ اخبارات و رسائل جو ہمیشہ جمہوری مفادات کا دم بھرتے ہیں اور ملک کی سالمیت و یکجہتی کا نعرہ لگاتے ہیں، کس طرح بڑی طاقتوں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں اور معاشرے کو اسلامی و اخلاقی عادلانہ قدروں سے دور رکھنے کے لئے کیا حربے اپناتے ہیں ان پر آپ نے بے لاگ گفتگو کی[19]۔

سید قطب کی یہی وہ تنقیدی نگاہ اور سیاسی بصیرت تھی جس کی وجہ سے دشمنوں کی نگاہ میں آپ خار کی طرح کھٹکتے تھے اور امریکہ، روس اور مصر کی استعماری نام نہاد شاہی اور پھر بعد میں فوجی حکومت آپ کے خلاف سازشوں کے جال بُننے میں ہمیشہ مصروف رہتی تھیں۔ آپ کی شخصیت میں وہ مومنانہ فراست بدرجۂ اتم موجود تھی جس سے ہر دور میں شیطان اور اس کے حواری لرزاں رہے ہیں۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ یوسف العظم، الشہید سید قطب، دار القلم بیروت ۱۹۸۰ء ص ۲۰۶

۲۔ مثال کے طور پر سوڈان میں اخوان المسلمون نے نمیری حکومت کے ساتھ تعاون کرکے جو کچھ حاصل کیا اور عوام میں اثر و نفوذ اور حکومتی مشینری میں عمل دخل حاصل کرنے کی جو کوشش کی اس کے ساتھ ہی سب سے بڑا نقصان جو اس تعاون کا ہوا وہ تحریک کی انقلابیت کی منفعلانہ حیثیت تھی۔ انقلاب اسلامی کا پورا تصور مجروح ہوا۔ مزید برآں نمیری حکومت نے تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر اس کے خلاف جو اقدامات کئے وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ تحریک کو عوام کی نظر میں بدنام کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی جو حکومتی اداروں کی طرف سے رچی گئی تھی۔ اس تجربہ سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ حکمرانوں کے ساتھ اس قسم کے اصلاحی پروگرام چلانے اور ان میں تعاون دینے کی پالیسی بہت زیادہ مفید نہیں ہے بلکہ اس سے تحریک اسلامی کو نقصان پہونچنے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔

۳۔ یہاں امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ جناب ڈاکٹر عرفان احمد کی ایک گفتگو نقل کرنا دلچسپ ہوگا۔ انھوں نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ء علی گڑھ میں انتفسو [International Islamic Faderation of Student organagaicons] ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات نقل کی کہ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آزادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندوستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ

میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمنِ اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وہ اس مسئلے میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں۔

۴۔ الوسادات کی ڈائری یا دلدی هـذا اعمك جمال الدار القومیة للطباعة والنشر بتاریخ ۱۱/۸/۱۹۶۵ ص ۳۱۲

۵۔ السلام العالمی والاسلام، مکتبہ وهبة مصر، الطبعة الثانیة۔ ص ۱۵۸۔۱۵۹۔

۶۔ نفس مصدر، ص ۱۵۹۔۱۶۰۔

۷۔ نفس مصدر، ص ۱۶۰۔۱۶۲۔

۸۔ نفس مصدر، ص ۱۶۳۔۱۶۴۔

۹۔ نفس مصدر، ص ۱۶۴۔

۱۰۔ نفس مصدر، ص ۱۶۵۔

۱۱۔ نفس مصدر، ص ۱۶۶۔

۱۲۔ العدالة الاجتماعیة فی الاسلام، مطبعة عیسٰی بابی الحلبی ۲۱ ایڈیشن، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۰۔۲۹۱

۱۳۔ السلام العالمی والاسلام، ص ۱۷۱۔ خود ہندوستان میں یہی صورت تھی۔ جب انگریزی فوج یہاں حملہ آور تھی تو ہندو اور مسلم خاندان کتنے ایسے تھے نے ہندوستانی مصالح و مفادات کے علی الرغم انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان سے مل کر لوٹ کھسوٹ مچائی اور انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے باوجود آزاد میں اقتدار میں سب سے زیادہ شرکت انہی کی ہے اور اپنی بے ضمیری اور تملق کی وجہ سے حکومت کے مناصب سے زیادہ وہی اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح

مسلم باشندوں پر فرانسیسی حملے کے وقت کچھ مسلمان خاندان ایسے بھی تھے جنھوں نے مسلمانوں سے غداری کر کے فرانس کی فوج کا ساتھ دیا ان میں ایک مشہور نام الجلادی بھی ہے جس نے فرانسیسی حملہ میں اپنا بیٹا بھی کھو دیا تھا لیکن اسے کوئی ندامت نہ تھی۔

معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ، مطبعۃ دار الکتاب العربی، قاہرہ ۱۹۵۲ء ص ۱۲۷ ـــ ۱۲۸

بدقسمتی سے آج تک پورے عالم اسلام میں وہی مغربی نظام تعلیم رائج ہے۔ ادھر چند برسوں میں علوم وفنون کی اسلام کاری (Islamization of Knowledge) کی مہم بڑے زور شور سے اٹھی لیکن دشمنوں نے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا اور اس کے مایۂ ناز کارکن تحریک اسلامی کے معروف خادم جناب پروفیسر اسماعیل راجی الفاروقی کو امریکہ میں شہید کر دیا۔ یہ تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ دیکھئے اس کے مسلم دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ، ص ۱۲۸ ـ ۱۲۹

تفصیل کے لیے دیکھئے خاکسار کی کتاب تاریخ دعوت وجہاد برصغیر کے تناظر میں ہندوستان پبلیکیشنز دہلی ۱۹۸۳ء ص ۱۰۶۔

شاہ ولی اللہ دہلوی، التفہیمات الالٰہیہ، جلد دوم ص ۱۳۴ ـ ۱۳۵

تفصیل کے لیے دیکھئے معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ ص ۱۵۲ ـ ۱۵۳۔